جناب حافظ عباد اللہ فاروقی

حضرت شاہ ولی اللہ محدِّثؒ اور اُن کا عہد

شاہ صاحبؒ کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے، آپ کی والدۂ محترمہ کا سلسلۂ نسب موسیٰ کاظم پر منتہی ہوتا ہے، اس لحاظ سے شاہ صاحبؒ خالص عربی النسل اور نسباً فارُوقی تھے۔ قیاس ہے کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ کے بعد پانچویں چھٹی پشت ہی میں افراد خاندان کے ناموں میں عجمیت آگئی تھی۔ اس لئے اندازہ ہے کہ یہ خاندان دوسری تیسری صدی میں ہی عرب سے نکل کر عجم میں آباد ہوگیا تھا۔

اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ جو ہندوستان میں تشریف لائے وہ شیخ شمس الدین مفتی تھے۔ انھوں نے اسلامی حکومت کے آغاز ہی میں رہتک میں اقامت اختیار کی۔ وہ ظاہری و باطنی علوم کے جامع تھے، اور تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے باکمال اور صاحبِ کشف بزرگ تھے۔ انھوں نے رہتک میں ایک دینی مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند شیخ کمال الدین مفتی ان کے جانشین ہوئے شیخ کمال الدین کے بعد ان کے فرزند قطب الدین نے مسندِ ارشاد و افتاء سنبھالی۔ شیخ قطب الدین کے فرزند شیخ عبدالملک کے عہد میں منصب قضا اس خاندان سے مخصوص ہوگیا۔ چنانچہ ان کے بعد ان کے بیٹے قاضی کبیر عرف قاضی بُدھا، پھر قاضی بُدھا کے بیٹے قاضی قاسم اور قاضی قاسم کے بیٹے قاضی قوام الدین یکے بعد دیگرے اس عہدے پر فائز ہوتے رہے۔

غرض خاندان کا ہر فرد علم و فضل کا منبع تھا۔

قاضی قوام الدین کے بیٹے شیخ محمود نے منصب قضا کو ترک کر کے سپاہیانہ زندگی اختیار کی لیکن مشاغل کے اس تغیر سے خاندان کی شہرتِ علم و فضل پر کوئی بُرا اثر نہ پڑا بلکہ ہر فرد نے آباء و اجداد کی اسی مقدس وراثت کو محفوظ رکھا۔ شیخ محمود کی شادی سونی پت کے ایک سادات گھرانے میں ہوئی تھی چنانچہ ان کے بیٹے شیخ احمد نے سونی پت ہی میں تعلیم و تربیت حاصل کی، جوان ہونے کے بعد وہ رہتک آئے تو قلعہ کے باہر ایک عالیشان عمارت تعمیر کرائی اور اپنے تمام خاندان کے افراد کو اس میں جگہ دی۔

شیخ احمد کے بیٹے شیخ منصور اور ان کے پوتے شیخ معظم بھی اگرچہ علم و فضل کے دریا تھے لیکن ان کی شہرت زیادہ تر سپاہیانہ کارناموں پر مبنی ہے۔ شیخ معظم کے بیٹے شیخ وجیہ الدین شاہ صاحبؒ کے دادا تھے۔ یہ بھی بڑے عالم اور صاحبِ حال بزرگ تھے، لیکن ان کی شہرت بھی اپنے باپ دادا کی طرح زیادہ تر جنگی کارناموں کے باعث ہے۔ عالمگیر اور اس کے بھائی شجاع کے مابین تخت نشینی کے سلسلے میں جو جنگ کھجوہ کے مقام پر ہوئی، اس میں شیخ وجیہ الدین عالمگیر کی طرف سے لڑے اور شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ عالمگیر نے فتح کے بعد اپنے ہاتھ سے شیخ موصوف کی کمر میں تلوار باندھی۔

آخر عمر میں شیخ وجیہ الدین سیواجی کی چیرہ دستیوں کی داستانیں سن کر جہاد کے شوق میں دکّن کی طرف تشریف لے گئے، لیکن راستہ میں رہزنوں سے مقابلہ ہوا اور اسی میں شہید ہو گئے۔

شاہ صاحبؒ کے والد شیخ ابوالفیض عبدالرحیم ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۳۱ھ میں ۷۷ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ شیخ عبدالرحیم نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے اور اس کے بعد اکبر آباد میں مرزا محمد زاہد ہروی سے بھی تعلیم حاصل کی۔ آپ چھوٹی عمر میں ظاہری علوم کی تمام منزلیں طے کر گئے۔ اس کے بعد آپ نے باطنی علوم کی طرف توجہ کی اور بڑے صاحب کمال بن گئے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب کے زمانے میں اس پر نظرثانی کی خدمت آپ کے ذمہ تھی۔ عام مسائل میں فقہ حنفی پر عمل تھا لیکن جو مسائل احادیث

کی رُو سے ان کے نزدیک مرجح تھے، ان پر فقہ حنفی سے اختلاف بھی کر لیتے تھے۔ مثلاً امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے، اور نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ ترک نہیں کرتے تھے۔ شیخ عبدالرحیم نے دہلی میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جو مدرسۂ رحیمیہ کے نام سے مشہور ہوا۔

شاہ صاحب ولی اللہؒ ۱۱۱۴ھ میں شوال کی چوتھی تاریخ کو چہار شنبہ کے دن طلوع آفتاب کے قریب کتم عدم سے عالم وجود میں آئے۔ عظیم الدین تاریخی نام رکھا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیخ عبدالرحیم کو ایک موقعہ پر جب وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر تشریف لے گئے تھے دورانِ زیارہ میں اشارہ ہوا تھا کہ تمہارے ہاں ایک فرزند ہوگا تم اس کا نام قطب الدین احمد رکھنا۔ شیخ عبدالرحیم کی اہلیہ شباب کی تمام منازل طے کر چکی تھیں اس لئے شیخ موصوف نے شیخ محمد کی صاحبزادی سے نکاح کیا۔ اسی خاتون کے بطن سے شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے۔ شیخ عبدالرحیم نے پہلے آپ کا نام ولی اللہ رکھا۔ لیکن بعد میں خواجہ قطب الدین رکھ دیا۔ لیکن آپ شاہ ولی اللہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ نے پندرہ سال کی عمر میں تمام متداولہ علوم کی رسمی تعلیم مکمل کر دی۔ چودہ سال کی عمر میں آپ نے شادی کی۔ شیخ عبدالرحیم کی وفات کے بعد شاہ صاحب نے مستقل طور پر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی زمانہ میں آپ کی توجہ قرآن حکیم کے ترجمہ کی طرف مبذول ہوئی جو فتح الرحمن کے نام سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ترجمۃ القرآن کی وجہ سے بعض لوگ آپ کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۱۴۳ھ میں آپ نے سفر حج اختیار کیا۔ حج کی اصل وجہ زیارتِ حرمین ہی تھی، تاہم شاہ صاحب یہ بھی چاہتے تھے کہ مخالفت و عناد کا طوفان رک جائے۔ آپ کم و بیش ایک سال تک مدینہ منورہ میں رہے۔ وہاں علماء حدیث اور مشائخ سے دلچسپ صحبتیں رہیں۔ آخر کار ۱۱۴۴ھ میں دوبارہ حج کر کے ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ کو جمعہ کے دن دہلی واپس تشریف لے آئے۔ آپ یہاں آتے ہی پھر مدرسۂ رحیمیہ کی مسندِ درس پر اپنے حقیقی وظیفہ میں مشغول ہو گئے۔

قیام حرمین کے دوران میں شاہ صاحب نے متقدر علماء و مشائخ سے کسب فیض کیا۔ انھوں نے حدیث پہلی مرتبہ شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھی تھی، پھر مدینہ منورہ میں شیخ

ابوطاہر مدنی سے سند حاصل کی۔ ان کے علاوہ آپ نے شیخ محمد وفد اللہ ابن شیخ محمد بن سلیمان المغربی کی درسگاہ میں بھی شرکت فرمائی۔ شاہ صاحبؒ شیخ تاج الدین صاحب حنفی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور بخاری کی سماعت کے علاوہ کتب صحاح ستہ کے بعض مشکل مقامات بھی حل کئے۔ مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد، کتاب الآثار امام محمد اور مسند دارمی کی بھی سماعت کی اور شیخ تاج الدین نے خصوصیت کے ساتھ آپ کو تحریری اجازت نامہ عطا فرمایا۔

جن بڑے بزرگوں سے آپ نے فیض حاصل کیا، ان کے نام مندرجۂ ذیل ہیں:-
شیخ احمد شناوی، شیخ احمد قشاشی، سید عبدالرحمٰن ادریسی، شمس الدین، علاء ایلی، شیخ عیسیٰ جعفری، شیخ حسن عجمی، شیخ احمد علی، شیخ عبداللہ بن سالم البصری۔

حج کے بعد آپ ۱۱۷۶ھ تک درس و تدریس و تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ ۱۱۷۶ھ میں ایک خفیف سی بیماری کے بعد ۶۳ سال کی عمر میں سفر آخرت اختیار کیا اور شاہجہان آباد کے جنوب میں پرانی دلّی میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

شاہ صاحبؒ کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ ان کی سعی و کوشش سے کتاب و سنت کا صحیح ذوق ہندوستان میں پیدا ہوا۔ نواب صدیق حسن خاں نے نہایت صحیح لکھا ہے کہ اگر شاہ صاحبؒ صدر اول میں موجود ہوتے تو امام الائمہ اور تاج المجتہدین کہلاتے۔

شاہ صاحبؒ کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد اکیاون بتائی جاتی ہے ان میں کم و بیش تیس چھوٹے چھوٹے رسائل پر مشتمل ہیں ان میں سے اکثر کمیاب ہیں۔

کتاب "فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن" یعنی قرآن حکیم کا فارسی ترجمہ ہے۔
قرآن کے متعلق شاہ صاحبؒ کے دو رسالے ہیں ایک الفوز الکبیر جو فارسی زبان میں ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اصولِ تفسیر کو نہایت جامعیت کے ساتھ بڑے سہل انداز میں بیان فرمایا ہے۔ دوسری کتاب فتح الخبیر ہے جو آیات قرآنی کی تمام ماثور تفسیر کا مرقع ہے۔

علم حدیث میں شاہ صاحبؒ کی دو شرحیں اول مصفّٰی جو فارسی زبان میں مؤطا امام مالکؒ کی نہایت جامع اور نہایت عمدہ شرح ہے، دوسری کا نام مسوّٰی ہے۔ یہ مؤطا کی عربی شرح ہے۔

فقہ حدیث میں شاہ صاحب کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ[1] ہے۔ فقہ حدیث میں شاہ صاحب کے اور دو رسالے ہیں، اول "انصاف فی بیان سبب الاختلاف" اور دوم "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید"، ان دونوں رسالوں میں اجتہاد و تقلید پر نہایت عمدہ بحث کی گئی ہے۔

خلافتِ صحابہ میں شاہ صاحب کی سب سے بڑی سب سے جامع اور سب سے بلند پایہ تصنیف ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ہے، یہ کتاب شاہ صاحب کے علم وحدیث و تفسیر و تاریخ اور کمالِ استخراجِ مسائل کا ایک ایسا مرقع ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔

علومِ تصوف میں شاہ صاحبؒ کے چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ مثلاً فیوض الحرمین (اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے) الطاف القدس، الدر الثمین، تاویل الاحادیث، رباعیتیں، ہوامع شرح حزب البحر، انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ، انفاس العارفین (اپنے بزرگوں کے حالات میں) تفہیماتِ الٰہیہ (چہل حدیث)، لمحات، ہمعات وغیرہ۔

اولاد | شاہ صاحب کے سب سے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز تھے، ان کی کوئی اولاد نرینہ نہ ہوئی صرف تین لڑکیاں تھیں۔ آپ کے دوسرے بیٹے شاہ رفیع الدین تھے۔ آپ کے تیسرے بیٹے شاہ عبدالقادر تھے، آپ کے چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی تھے، انہی کے صُلب سے شاہ اسماعیل شہیدؒ پیدا ہوئے۔

آپ کا عہد | شاہ صاحبؒ کا زمانہ سیاسی اعتبار سے نہایت پر آشوب دَور تھا۔ جاٹوں

---

[1] میرے شیخ حضرت مولانا سید میرک شاہ صاحب کا خیال ہے، آج تک اس فن میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ سید میرک شاہ صاحب ایبک روڈ لاہور کی جامع مسجد میں ۱۹۶۲ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک ہفتہ وار اس کتاب کا درس دیتے رہے اب بوجہ کہن سالی معذور ہو چکے ہیں۔

کی عملداری میں مسلمان خستہ وتباہ حال ہوگئے تھے، ان کی تمام دولت پر جاٹوں نے قبضہ کر رکھا تھا، وہ مساجد کو تباہ کر رہے تھے، اذان دینے کی اجازت نہ تھی، احمد شاہ ابدالی کے نام ایک خط میں حضرت شاہ صاحب نے ان تباہ کاریوں کی جانب اشارہ کیا ہے [۱]

یہ وہ زمانہ تھا جب مرہٹوں کا خطرہ کافی تشویشناک ہوگیا تھا، انھوں نے گجرات کے ایک قصبہ پر قبضہ کر رکھا تھا اور بندیل کھنڈ کو بانٹ لیا تھا، شاہی افواج ان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گوالیار سے لے کر اجمیر تک کے علاقے ان کے تسلط میں آگئے، ۱۷۵۴ء میں باجی راؤ پیشوا نے دہلی اور اس کے نواحی علاقوں کو لوٹ لیا۔

جاٹوں کے ظلم وستم کی انتہا ہوچکی تھی، سکھوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ ایرانی وتورانی جھگڑے بھی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ بعض تورانی امراء نے نادرشاہ کو اصلاح حال کی امید پر دعوت دی۔

لیکن مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم فرماتے ہیں:

سچ یہ ہے اور واقعات اس کے مؤید ہیں کہ ایرانیوں کی قوت کو سادات کی تباہی سے جو کمزوری ہوئی تھی اس کی تلافی کیلئے غریب تورانیوں پر نادرشاہ کو اکسا کر بلایا گیا تھا۔"

بہرحال نادرشاہ کو کسی طرف سے بلایا گیا ہو اس کے عذاب الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا گیا۔ نادری غارت گری کی وجہ سے بے شمار بے گناہ لوگوں کا خون بہایا گیا۔ عرصہ تک دہلی کی گلیاں لاشوں سے پٹی رہیں۔ آخر دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نادرشاہ کے وزیر نے یہ شعر پڑھا ؎

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

---

[۱] ملاحظہ ہو مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہؒ مرتبہ خلیق احمد نظامی علیگڑھ

اس پر نادر شاہ نے تلوار نیام میں ڈالی اور قتلِ عام بند ہوا۔ نادر شاہ نے دہلی کو کس طرح لوٹا اس کا اندازہ ان بیانات سے لگایا جا سکتا ہے۔

مولانا محمد میاں لکھتے ہیں: "بائیس کروڑ روپے نقد خزانہ شاہی سے اور تقریباً نوّے کروڑ کے جواہرات اور تختِ طاؤس بھی قلعہ سے لوٹے گئے"۔[۱]

آنند رام مخلص کا بیان ہے کہ صرف جواہرات کی قیمت پچاس کروڑ سے کم نہ تھی۔ اسی مالِ غنیمت میں تختِ طاؤس اور کوہ نور ہیرا بھی تھا۔ اور تین سو ہاتھی دس ہزار گھوڑے اور اتنے ہی اونٹ تھے۔

مولانا ذکاء اللہ نے قتلِ عام میں مرنے والوں کا اندازہ آٹھ ہزار سے ڈیڑھ لاکھ تک لگایا ہے۔

نادر شاہ کے قتل و غارت نے دہلی کو اقتصادی لحاظ سے تباہ کر دیا تھا۔ صوبے مرکزی حکومت سے آزاد ہو چلے تھے، مہابت خان بنگال و بہار میں خود مختار بن بیٹھا تھا اور نظام الملک دکن میں، اودھ کے صوبے میں صفدر جنگ کی حکومت تھی، اور فرخ آباد میں بنگش رئیس اور روہیل کھنڈ میں روہیلہ سردار، آزاد ریاستوں کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ مرکزی حکومت کی اس کمزوری نے بالآخر انگریز کو ہندوستان میں دعوت دی۔

اس دور میں ایرانی و تورانی اُمراء کی کش مکش تو پہلے ہی سے تھی لیکن نادر شاہ کے حملہ کے بعد روہیلوں کا عنصر بھی اس میں شامل ہو گیا۔ نادر شاہ کابل و قندھار کے راستہ ہندوستان وارد ہوا تھا، راستہ میں روہیلوں کو شکست دیتا ہوا یہاں پہنچا۔ ہزیمت خوردہ لوگوں نے ہندوستان میں پناہ ڈھونڈی۔

احمد شاہ ابدالی کو شروع سے روہیلوں کی امداد حاصل تھی، اس طرح نادر شاہ کے ظلم و ستم اور احمد شاہ ابدالی کی اعانت نے روہیلوں کو ہندوستان کے سیاسی افق پر نمایاں کیا چنانچہ ۱۱۷۵ھ میں جب عالمگیر ثانی کے بیٹے گوہر کو عالم شاہ کے لقب سے احمد شاہ ابدالی

---

[۱] علمائے ہند کا شاندار ماضی مصنفہ مولانا محمد میاں

نے تخت پر بٹھایا، نجیب الدولہ روہیلہ کو امیرالامراء مقرر کیا تھا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت روہیلے اتنی بڑی سیاسی قوت بن چکے تھے کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس زمانہ (اٹھارہویں صدی) میں بریلی میں روہیلوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔

غرض مرہٹوں کے دہلی پر حملے، سکھوں کی تاخت و تاراج، جاٹوں کی لوٹ مار اور نادر شاہ کی یورش کے پورے دور میں شاہ ولی اللہ دہلی میں موجود رہے اور درس و تدریس تصنیف و تالیف اور غور و فکر میں اپنا وقت بسر کیا۔ شاہ صاحب نے اصلاح کے لئے بھی پوری کوشش کی۔

جب ابدالیوں نے ہندوستان پر حملے کئے اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا تو یہ منظر بھی شاہ صاحبؒ نے دیکھا۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے مقام پر دو لاکھ مرہٹہ سپاہیوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا، شاہ صاحبؒ نے یہ سب حالات دیکھے۔ آخر ۲۰ اگست ۱۷۶۲ء دہلی میں انتقال کیا۔

شاہ ولی اللہؒ کی تعلیم (اُردو) از پروفیسر غلام حسین جلبانی

پروفیسر جلبانی ایم۔اے سابق صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے۔ اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے، اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا ہے اور قدردان پڑھنے والوں کے اصرار پر دوسرا ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ معیار طباعت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر۔ حیدرآباد۔ سندھ